شہید شفیع بلوچ

کامریڈ فقیر

بِیر پبلی کیشنز

BEER PUBLICATIONS

beer.publications@gmail.com

کتاب : شہید شفیع بلوچ

تحریر : کامریڈ فقیر

سال : مئی 2010

پبلشر : بِیر پبلی کیشنز (بلوچستان)

قیمت : 30روپے

انتساب

اُن شہداء کے نام
جو پہاڑوں پر بلوچ آجوی کی جنگ
لڑتے لڑتے گُمنام ہوئے۔

ایک خاموش اشارے کے منتظر فوجی نے چند لمحوں میں اپنا نشانہ باندھا اور جی تھری کی گولیوں کی تھرتھراہٹ نے ساری وادی میں سُکوت توڑ دیا اور شفیع بلوچ اپنی دھرتی ماں کی گود میں آ گرے۔

پیش لفظ

نئی زندگی کیلئے سماجی انقلاب کا راستہ ہو یا قومی آزادی کی تحریک کا راستہ، ان راستوں پر چل کر ہزاروں جانثارانِ وطن نے اپنی زندگیاں قربان کی ہیں۔ لیکن ان خونی معرکوں میں ایسے جانثار بھی ہوتے ہیں جن کی موت ان ہزاروں جانثاروں کی موت سے منفرد ہوتی ہے اوران کی موت تحریکوں میں روح پھونکتی ہیں۔ ان کی منفرد موت نہ صرف تاریخی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں بلکہ آنے والی نسلوں کیلئے بھی مشعل راہ بن جاتی ہیں۔ ان کی تصاویر بازاروں اوراسٹالوں میں بکتی ہیں۔ ہر سال ان کی برسی شایان شان طریقے سے منائی جاتی ہیں۔ چے گویرا، جوزے مارتی، بھگت سنگھ، حمید بلوچ اور نواب نوروز خان جیسے دیگر شہدا کی جرأت واستقلال کی منفرد اموات نے خواب غفلت میں سوئی ہوئی محکوم اقوام اور دنیا بھر کے دست نگر مظلوم انسانوں کو جھنجھوڑتے ہوئے انہیں آزادی اورقومی بقاء کی جدوجہد کیلئے بیدار کیا ہے۔

بلوچ قوم جو کہ ہمیشہ قابضین کے دستِ نگر رہی ہے اورصدیوں سے اپنی قومی بقااورشناخت کی جنگ لڑتی آرہی ہے، آج بھی شدّت سے اپنی بقااورقومی شناخت کی اس جنگ کواپنی منزل کی طرف بڑھارہی ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ وہ جہاں پلا بڑھا ہواُس خاک ومٹی سے اُس کوایک عجیب سی محبت اورانسیت ہوجاتی ہے اور اس کی خاطر مرمٹنے پرآمادہ ہوجاتا ہے۔

بلوچ قوم ان اقوام میں شامل ہے جنہوں نے غاصب اور قبضہ گیروں کے سامنے کبھی اپنی گردن نہیں جھکائی بلکہ انہوں نے غلامی کی زندگی پر موت کو ہمیشہ ترجیح دی ہے۔ ہزاروں جانیں بلوچ وطن پر قربان ہوکر نمیران ہوگئے ہیں۔ جب بلوچ شہداء کا نام آتا ہے تواس فرزند کا بھی نام آتا ہے کہ جس کی موت نے اسے ہزاروں جانثاروں سے منفرد بنادیا۔ وہ منفرد موت شفیع بلوچ کی ہے کہ جنہوں نے اپنے ساتھیوں کی زندگی کی خاطر خودکونثار کردیا۔

آج ایک مرتبہ پھرظلم وبربریت کی تاریخ خودکودھرارہی ہے۔ شہید شفیع بلوچ کا وطن آج پھرخون آلود ہے۔ قابض قوتوں کی سفاکانہ اورننگی جارحیت اپنی انتہا پر ہے۔ اورحق وباطل کی اس جنگ میں حق کی راہ پر گامزن بے شمار سیاسی کارکنوں کو راستے سے ہٹانے کیلئے اذیت کےنت نئے اورجدیدطریقے آزمائے جارہے ہیں۔

ان تمام مظالم اورزیادتیوں کے باوجود بھی انقلاب کی نوید سنانے والی سیاسی جماعتوں کے رویوں میں رتی برابر تبدیلی نہیں آئی ہے۔ اور وہ ابھی تک لینن اور مارکس کی پیروی میں لفاظی کی حدتک لمبے لمبے بھاشنوں اور بے تُکے دلائل کی بے بنیاداور بےسرے راگ الاپنے تک ہی محدود ہیں۔

ہم جانتے ہیں کہ تحریکیں علم ولٹریچر کے بغیر جامع اورموثرنہیں ہوسکتیں۔ اسی کمی کومحسوس کرتے ہوئے ''ہیر پبلی کیشنز'' کے دوستوں نے اس بارِگراں کو اپنے کندھوں پر اٹھانے کا تہیہ کیا ہوا ہے کہ وہ ان بکھرے موتیوں اور چمکتے ستاروں کو یکجا

کر کے بلوچ قوم کی تاریخ میں پروئے گی۔ وہ شہداء کہ جنہوں نے دھرتی کی لاج رکھتے ہوئے بھوک، افلاس، تکلیف اور اذیتیں سہہ کر قوم کو خوشحال زندگی بخشنے کی خاطر اپنی جوان زندگیاں قربان کی ہیں۔

بِیر پبلی کیشنز اپنے وطن اور قوم کی خاطر مر مٹنے والے ان منفرد کرداروں کو کتابی صورت دے کر نئی نسل کے سپرد کر کے انہیں ان کی جدوجہد اور شہادتوں کے بارے میں شعور و آگہی فراہم کرتی رہے گی۔ تاکہ آنے والی نسل اس بات سے باخبر ہوں کہ ان کرداروں نے کس طرح ان کیلئے اپنی بے مثال زندگیاں قربان کی ہیں۔ زیر نظر کتابچہ کامریڈ فقیر کی تحریر کردہ ہے اس سے پہلے بھی مصنف کی دو کتابیں ''بلوچستان معاشی و سیاسی تناظر میں'' اور ''نواب نوروز خان اور اُس کے ساتھی'' چھپ چکی ہیں۔ اس کتاب کی تدوین و ترتیب کیلئے ہم ناصر سنگت کے بھی ممنون و مشکور ہیں۔ نیز شہید شفیع بلوچ پر تحریر کیا گیا یہ کتابچہ نامکمل ہے، اگر اس متعلق کسی کے پاس مزید شہادتیں اور مواد ہو تو برائے کرم وہ ''بِیر پبلی کیشنز'' کے ای میل پر ہمیں بھیج دیں۔ تاکہ اگلے ایڈیشن کو ہم مزید جامع انداز سے شائع کر سکیں۔

ادارہ

☆☆☆

شفیع بلوچ تاریخ میں امر ہو گئے

دنیا کی تاریخ بیرونی حملہ آوروں کے قبضوں اور تسلط سے آزادی کے لئے لڑتے ہوئے اپنی جان قربان کرنے والے شہداء سے بھری پڑی ہے۔ قومی، نسلی، طبقاتی اور غلامی کی دیگر اشکال کے خلاف لڑی جانے والی آزادی کی جنگوں، معرکوں اور صبر آزما و کھٹن تحریکات کی کامیابیوں میں ان شہداء کے خون نے کلیدی کردار ادا کیا ہے جبکہ یہ بھی شہداء کے خون کے دوررس اثرات کا ہی نتیجہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات آزادی کی تحریکیں نشیب میں جانے کے باوجود کسی نہ کسی صورت میں زندہ رہتی ہیں اور بدلتے وقت کے ساتھ ایک بار پھر بھرپور قوت سے سر اٹھاتی ہیں، جس کی دنیا میں مختلف مثالیں تاریخی حقائق کی شکل میں موجود ہیں۔ مگر بلوچ قومی تحریک آج ایک زندہ مثال ہے جو غیر ملکی حملہ آوروں اور قابض استعماری قوتوں کے خلاف برسرِ پیکار ہے۔ گوکہ یہ بلوچ مزاحمت نشیب و فراز کے مختلف مرحلوں سے گزری اور یہ جذبہ اس لئے بھی ایک منفرد مقام رکھتا ہے کہ بعض اوقات تو اس نے بلوچ قوم کی شناخت، عزت اور وقار کے لئے جانوں کے نذرانے پیش کرنے کے جذبے اور عمل سے اُسے زندہ رکھا۔ کیونکہ بلوچ نے حملہ آوروں کے خلاف مزاحمت صرف فتح اور جیت کی امید پر نہیں کی بلکہ اس کا یہ عمل اپنی دھرتی اور قوم کے آگے عاجزانہ رہا اور اپنی دھرتی کا قرض اتارنے کے لئے وہ میدان جنگ میں اُترا، جسکی روشن مثال خان

آف قلات میر مہراب خان کی 1939ء میں برطانوی استعمار کے بلوچستان پر قبضے کے خلاف جنگ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ جب میر مہراب خان شہید بے سروسامانی کے عالم میں انگریز سے جنگ کے لئے نکلے تو ان کی والدہ نے کہا کہ

"آپ قلیل تعداد اور کم ہتھیاروں کے ساتھ کس طرح انگریز کی ایک بڑی فوجی طاقت سے لڑ سکتے ہیں"

جس پر خان مہراب خان نے یہ کہہ کر کہ

"وہ فتح کیلئے نہیں بلکہ اپنی دھرتی کا قرض اُتارنے کیلئے انگریز سے لڑینگے۔"

مہراب خان کی اس بات نے بلاتخصیص پورے بلوچ قوم کے مزاج اور اس میں موجزن ایثار و قربانی کے عاجزانہ جذبے کی عکاسی کردی ہے، اسی لئے وطن اور قوم کی محبت سے سرشار بلوچ سپوتوں نے قربانی اور بہادری کی لازوال داستانیں رقم کیں لیکن ہر شہید کا انداز شہادت اور کردار منفرد رہا ہے۔ شہادتوں کے اس تسلسل میں شہید شفیع بلوچ اپنے منفرد کردار کے باعث نمایاں نظر آتے ہیں۔ جنہوں نے اپنے سرمچار ساتھیوں کی جان بچاتے ہوئے اپنی جان دے دی۔ شفیع بلوچ ضلع مستونگ کے علاقے اسپلنجی میں جمی کے پہاڑوں میں شہید ہوئے۔ جب اُنھیں شہید کیا گیا تب اُن کے پاس بندوق نہیں تھی اور اُن کے دونوں ہاتھ خالی تھے۔

شفیع بلوچ سینکڑوں پاکستانی فوجیوں کے محاصرے میں تنہا کھڑے تھے۔ دشمن

فوج نے اُن کی آنکھوں پر پٹی باندھی اور دونوں ہاتھ پیچھے باندھ کر اُنھیں گولیوں سے چھلنی کردیا اور وہ خون میں لت پت ہوکر گر پڑے۔ شہید شفیع کی بارود میں لپٹی ہوئی لاش کئی ہفتوں تک جمی کی یخ بستہ وادی میں خاموش پڑی رہی۔ اس کے ہموطنوں نے جب اُن کی لاش کو اُٹھایا تو اُن کا چہرہ اپنے قومی فرض کی ادائیگی کے اطمینان سے چمک رہا تھا اور جب شہید شفیع کو بلوچ دھرتی ماں کے سینے میں آسودہ ء خاک کیا جارہا تھا تو شفیع کا چہرہ مسکرا رہا تھا۔

بلوچ قوم کا یہ بہادر سپوت 1950ء میں بلوچستان کے ضلع کچھی کے ایک گاؤں جنڈڑ میں میر شاہ داد خان بنگلزئی کے ہاں پیدا ہوا۔ شفیع کے والد محترم کا تعلق بنگلزئی قبیلے کی ذیلی شاخ سردار خیل سے تھا اور وہ اپنے علاقے میں زمینداری کرتے تھے۔ شفیع بلوچ نے ابتدائی تعلیم اپنے آبائی گاؤں جنڈڑ میں حاصل کی اور بھاگ کے اسکول سے میٹرک پاس کیا اور پھر مستونگ کالج سے انٹر کیا۔ اس دوران شہید شفیع بلوچ نے بلوچ نوجوانوں کی قوم دوست، وطن دوست، ترقی پسند طلباء تنظیم بی ایس او کی رکنیت حاصل کرلی اور ایک کارکن کی حیثیت سے تنظیمی سرگرمیوں میں جُت گئے۔ یہی وہ دور تھا جب شفیع بلوچ کی انقلابی، نظریاتی، سیاسی و تنظیمی تربیت اور ذہنی نشوونما ہوئی۔ انہوں نے اپنی تعلیم جاری رکھنے کے ساتھ ساتھ ترقی پسند انقلابی لٹریچر کے مطالعہ پر بھی خصوصی توجہ دی۔ شفیع مارکسزم، لینزم کے انقلابی نظریاتی رجحانات کے حامل تھے۔ ان کے خیال میں قومی آزادی کے سوال کو جس طرح لینن

نے پیش کیا ہے وہ محکوم قوموں کے لئے نجات کا واحد راستہ ہے۔ان کے ذہن میں ایک غیر طبقاتی سوشلسٹ بلوچستان کا تصور تھا۔شفیع اب ایک ڈسپلن میں تھے۔ انہوں نے تنظیمی فیصلوں کے تحت سیاسی سرگرمیاں شروع کر رکھیں۔انٹر کالج مستونگ سے فراغت کے بعد انہوں نے اپنی تعلیم جاری رکھی اور ڈگری کالج کوئٹہ میں داخلہ لیا اور یہیں سے گریجویشن کی ڈگری حاصل کی۔

شفیع کچھ عرصہ شہید نواب اکبر خان بگٹی کے قریب بھی رہے۔شفیع بلوچ نے ایک مختصر عرصے تک سمال انڈسٹریز میں ملازمت بھی کی۔شفیع بچپن میں ہی مزاجاً لڑاکو اور جھگڑالو طبیعت کے حامل تھے۔کبھی کسی کے سر سے ٹوپی لے اُڑے تو کبھی کسی سے اُلجھ پڑے یا کہیں دیوار پھلانگ کر کسی کے باغ سے پھل توڑ لیئے۔غرض شفیع بچپن میں معمولی مسئلے پر بھی لوگوں سے اُلجھ پڑتے تھے حتیٰ کہ مقامی انتظامیہ کے افسران اور علاقے کے معتبرین پر بھی چڑھ دوڑتے۔روز لوگ ان کے والد کے پاس شکایتیں لے کر آتے۔

بہر حال شفیع نے جس ماحول میں آنکھ کھولی وہ جنگجویانہ تھا۔اُن کا وطن غیروں کے قبضے میں تھا اور ساری فضا بارود کے دھویں سے آلودہ تھی۔قابض قوت اپنی ایک بڑی فوجی طاقت کے بل بوتے پر ساری دھرتی کو اپنے حصار میں لے چکی تھی۔شفیع چونکہ اس ظالمانہ کیفیت کے باعث اندر سے آزادی کی تڑپ اور دشمن کو مٹانے کی آگ میں جل رہے تھے۔لہذا ان کے لاشعور میں پایا جانے والا یہ احساس ان کی تند

مزاجی کی مختلف وجوہات میں سے ایک وجہ ہوسکتی ہے۔جو اُسے ہتھیار اٹھا کر قابض دشمن کا مقابلہ کرنے کی راہ پر لے آئی۔1973ء میں جب شفیع کی عمر 22برس تھی ایک مرتبہ پھر اُن کے وطن پر فوجی یلغار ہوئی اور اُن کے بلوچ ہم وطنوں کی نسل کُشی کا آغاز ہوا۔بلوچ دھرتی پر قابض استعماری قوت نے ظلم و بربریت کا بازار گرم کر دیا۔ بلوچ سیاسی رہنماؤں اور کارکنوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی اور بلوچ نوجوان پہاڑوں کا رُخ کرنے لگے۔جن مخدوش سیاسی حالات میں شفیع پل کر بڑھے ان حالات کے تسلسل نے اُسے عملی زندگی کے راستے پر ڈال دیا۔یکم جنوری 1975 کا دن شفیع بلوچ کو، اس میں بچپن سے بھرے ہوئے غصے کو اتارنے کی درست راہ پر ڈالنے کی بنیاد بنا۔انہوں نے اپنی سرکاری ملازمت کی پرواہ کئے بغیر اپنے ایک ساتھی کے ساتھ ملکر بلوچ قومی آجوی اور انقلاب کا پرچم تھام لیا۔اُنھوں نے صرف ایک بار پیچھے پلٹ کر دیکھا اور تیز قدموں سے چلتے ہوئے پہاڑوں کے اُس پار نظروں سے اوجھل ہوگئے۔اور پھر کبھی واپس نہیں آئے۔جہاں ان کا نام بدل کر لشکر خان پڑ گیا اور خفیہ ایجنسیوں کی فہرستوں میں اپنے وطن اور قومی حقوق کے لئے مرمٹنے والے ایک اور بلوچ باغی کا اضافہ ہوگیا۔

لشکر خان طویل مسافت طے کرنے کے بعد سات جنوری کو اپنے پہلے مزاحمتی کیمپ پہنچے۔جہاں اُنھیں نئے ساتھیوں کے علاوہ معروف بلوچ کمانڈر میر سفر خان زرکزئی کو پہلی بار قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔لشکر خان ایک رنگروٹ سپاہی کی

حیثیت سے کیمپ میں متعارف ہوئے۔

اس دوران لشکر خان نے کسی بھی موقعہ پر اپنے پڑھے لکھے بابو یا سیاسی زانت کار ہونے کا دعویٰ نہیں کیا اور دن گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ خود کو نئے ساتھیوں میں ضم کرتے چلے گئے۔ اور کیمپ کی ذمہ داریاں نبھانے لگے۔ وہ کیمپ میں پانی لاتے، آٹا گوندھتے، کھانا پکاتے، لکڑیاں جمع کرتے اور کیمپ کی اشیاء پر نظر رکھتے۔ کیمپ کے کام کاج کے علاوہ لشکر خان ساتھیوں کا خیال رکھتے تھے اور انہیں پڑھنا لکھنا سکھاتے تھے۔ اس کام کیلئے انہوں نے باقاعدہ ایک وقت مقرر کر رکھا تھا۔ جب وہ قندھار میں تھے تو وہاں مری مہاجرین کے بچوں کو پڑھاتے تھے۔ فراغت کے اوقات میں وہ اپنے ارد گرد ساتھیوں کی کچہری لگاتے اور ان کی سیاسی تربیت کرتے اور بیمار ساتھیوں کی تیمارداری کرتے۔ ان کی دلجوئی کیلئے ان کے پاس بیٹھ کر گپ شپ لگاتے۔ ان کے کپڑے دھوتے اور ان کی حجامت بناتے۔ بحیثیت ایک سیاسی و نظریاتی کارکن وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ بلوچ قومی آزادی اور انقلاب کی اصل محرکہ قوتیں، کسان، چرواہے، اور پہوال تھے۔ جو قومی مسلح جہد میں شامل ہراوّل دستے کا کردار ادا کر رہے ہیں۔ اس لئے لشکر خان تمام ساتھیوں کو یکساں احترام دیتے تھے۔ اور ان کے جذبات کا خیال کرتے۔ لشکر خان اس وقت تک کھانے پر نہ بیٹھتے جب تک سارے ساتھی اکٹھے نہ ہوجاتے۔ اس دوران انہوں نے انقلابی لٹریچر کا مطالعہ جاری رکھا وہ لینن کی تصانیف کو دلچسپی سے پڑھتے۔

لشکر خان خاموش طبع واقع ہوئے تھے وہ بے مقصد گفتگو سے پرہیز کرتے۔ وہ گیارہ ماہ 20 دنوں تک اپنے کاندھوں پر بھاری وزن لیئے بلوچستان کے سخت ناہموار پہاڑوں اور بیابانوں پر پیدل سفر کرتے رہے۔ لیکن اُنھوں نے تھکن اور کمزوری کا کبھی اظہار نہیں کیا۔ لشکر خان ایک نئے بلوچستان جو ظلم اور ہر قسم کے استحصال سے پاک اور نئے خوشحال بلوچ سماج کی تعمیر و تشکیل چاہتے تھے۔ جہاں سیاست و معیشت اور وسائل پر عوام کی بالادستی ہو، جہاں انصاف ہو، اعلیٰ انسانی اقدار کا بول بالا ہو اور بلوچ عوام کی صدیوں سے جاری غربت اور پسماندگی کا خاتمہ ہو۔

لشکر خان گیارہ ماہ بیس دن پہاڑوں میں رہے، اُنھیں چھ ماہ کے بعد تھری ناٹ تھری کی ایک پُرانی رائفل بمعہ 60 گولیوں کے دی گئی۔

جون 1975ء میں موسم سخت گرم تھا، لشکر خان کا مزاحمتی موبائل کیمپ قندھار کی وادی میں دلبند کے پہاڑی سلسلے میں قائم تھا۔ اس موقع پر اطلاع آئی کہ پاکستانی فوج ساراوان کے علاقے میں آپریشن کی تیاری کر رہی ہے۔ کمانڈر کے حکم پر کیمپ کا سارا سامان سمیٹ لیا گیا اور ایک دوسرے مقام کی جانب روانہ ہوگئے۔ صبح گیارہ بجے روانہ ہونے والا یہ قافلہ رات بارہ بجے دلبند پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گیا۔ جہاں سینکڑوں فٹ اُونچی چوٹی پر جون کے گرم ترین ماہ میں بھی اتنی شدید سردی تھی کہ خود کو گرم رکھنے کیلئے انہیں آگ جلانی پڑی۔ چند گھنٹے آرام و تھکن دُور کرنے کے بعد سرمچاروں کا یہ قافلہ صبح سویرے پھر اپنی نامعلوم منزل کی طرف رواں دواں رہا۔

یہ دسمبر 1975ء کا مہینہ تھا اور کوہک پہاڑی سلسلہ سخت سردی کی لپیٹ میں تھا۔ یخ بستہ ہوائیں چُھری کی مانند جسم کو چھید رہی تھیں۔ کیمپ کمانڈر نے لشکر خان کو کسی ضروری کام کے لئے کوئٹہ روانہ کر دیا۔ لشکر خان کمر کے پہاڑوں کا راستہ عبور کر کے کھڈ کوچہ میں شاہراہ آر سی ڈی پہنچ گئے۔ جہاں وہ سڑک پر بس کے انتظار میں تھے کہ اس دوران انہیں سامنے منگوچر کی طرف سے ایک پرائیوٹ ٹرک مستونگ کی جانب آتا ہوا نظر آیا۔ لیکن اس ٹرک میں فوجی سوار تھے جس کا لشکر خان کو علم نہیں تھا۔ لہذا جب ٹرک قریب پہنچا تو لشکر خان نے ٹرک کو رکنے کا اشارہ کیا۔ جس پر ٹرک اُن کے قریب آ کر رُک گیا۔ لشکر خان اطمینان سے ٹرک کے پچھلے حصے میں سوار ہوئے۔ لیکن ٹرک میں موجود فوجیوں کو دیکھ کر وہ چونک گئے اور حالات کا مشاہدہ کرنے لگے۔

ٹرک میں موجود ایک فوجی نے ان سے پوچھا

''کہاں جانا ہے؟''

لشکر خان نے جواب دیا

''مستونگ''

پھر سوال ہوا

''کس قبیلے سے تعلق رکھتے ہو؟''

جواب آیا

''شاہوانی قبیلے سے''

''کہاں رہتے ہو؟''

''کھڈ کوچہ''

''کیا کرتے ہو؟''

''زمینداری''

اس دوران ٹرک اپنی منزل کی جانب رواں رہتا ہے۔ کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد لشکر خان کو یقین ہو گیا کہ فوجیوں کو ان پر شک نہیں ہوا۔ جس پر اُنھوں نے خود کو محفوظ سمجھا۔ ٹرک آگے جا کر مستونگ تھانے کے قریب رُکا۔ چند فوجی ٹرک سے اترے ان کے ساتھ لشکر خان بھی اتر گئے اور اطمینان سے فوجیوں کی مخالف سمت چلے گئے۔ جہاں وہ بس میں کوئٹہ کیلئے روانہ ہو گئے۔ 16 دسمبر کو لشکر خان کوئٹہ پہنچے اور 17 دسمبر 1975 کو شام چار بجے مخبر کی مدد سے پولیس نے انہیں جان محمد روڈ کوئٹہ کے ایک ہوٹل سے شفیع محمد بلوچ کے نام سے گرفتار کر لیا اور رات بھر اُنھیں جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ پولیس اُن کے ساتھیوں کے بارے میں ان سے معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ شفیع بلوچ سے کچھ بھی نہ اگلوا سکے۔

18 دسمبر 1975 کو علیٰ الصبح پولیس نے شفیع بلوچ کو فوج کی تفتیشی ٹیم کے حوالے کر دیا۔ جہاں 19 دسمبر یعنی دو دن تک فوج ان سے کیمپ کمانڈر میر سفر خان، میر گہور خان، آغا سلیمان، میر عبدالنبی اور دیگر سرمچاروں کے ٹھکانوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کیلئے ان پر جسمانی تشدد کرتی رہی۔ اس دوران شفیع کو

انتہائی انسانیت سوز اذیتیں دی گئیں۔ ان کے سر کے بال نوچ لئے گئے۔ اُن کے جسم کو جلتے سگریٹ سے داغا گیا اور منہ کے اگلے دو دانت توڑ دیئے گئے۔ مگر اُن تمام تر وحشیانہ اور انتہائی کربناک تشدد زدہ کیفیت سے گزرنے کے باوجود شفیع نے اپنے ساتھیوں اور ان کے ٹھکانوں کے بارے میں منہ نہیں کھولا اور انتہائی حوصلے سے پاکستانی فوج کا وحشیانہ تشدد برداشت کرتے رہے۔

مخبر کی نشاندہی پر 19 دسمبر کو فوج نے ضلع مستونگ کے پہاڑی علاقے جمی (کابوہ) کوہ ماران سمیت اسپلنجی کے تمام علاقوں کو اپنے محاصرے میں لے لیا اور رات بھر علاقے کا آپریشن کیا۔ 20 دسمبر 1975ء کو صبح سویرے فوج جمی پہاڑی کے اُس مقام پر پہنچ گئی جہاں سرمچاروں کا کیمپ تھا۔ مگر فوج کی آمد سے قبل ہی سرمچار جگہ چھوڑ کر جا چکے تھے۔ اور کیمپ کے مقام پر ویرانہ تھا۔ اُس کیمپ میں موجود سرمچاروں میں میر سفر خان، میر گہور خان، آغا سلیمان احمد زئی اور دیگر چالیس ساتھی شامل تھے۔ اس آپریشن کے دوران فوج شفیع بلوچ کو بھی کوئٹہ سے اپنے ساتھ لائی تا کہ وہ اُن پر تشدد کے ذریعے اُن کے ساتھیوں کے ٹھکانے کا پتہ معلوم کر سکیں۔ مگر فوج اس میں کامیاب نہ ہوسکی۔ جس کے باعث فوج اس دوران علاقے میں بھٹکتی پھرتی رہی اور وہ شفیع کے کیمپ کے ساتھیوں تک پہنچنے میں ناکام رہی۔ یہ صبح کا وقت تھا جمی کے یخ بستہ موسم کے باعث ہر سال کی طرح اس بار بھی مقامی آبادی علاقہ خالی کر کے گرم علاقوں کی طرف کوچ کر چکی تھی اور ہر طرف سناٹا تھا۔ جمی کوہ ماران،

غار کا علاقہ، کوہ سیاہ، کابوہ کے پہاڑ، دشت اور اسپلنجی کے میدان خاموشی اور افسردگی سے اس دردناک منظر کو دیکھ رہے تھے۔ جس میں شفیع سینکڑوں فوجیوں کے نرغے میں تنہا کھڑے ان کا سامنا کر رہے تھے جوان پر اپنا غصہ اتار رہے تھے۔ آپریشن میں مسلسل ناکامی کے بعد فوج کا کمانڈر طیش میں آ گیا اور بندوق کے بٹ سے شفیع پر حملہ آور ہوا اور گندی گالیاں دینے لگا، شفیع نے یہاں پر جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سخت مزاحمت کی اور فوجی افسر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا:

''اگر تم مجھے مارنا چاہتے ہو تو سُن لو، میں بھی مرنے کیلئے پُرعزم ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے اپنے ساتھیوں کو تمھاری گولیوں کا نشانہ بننے سے بچالیا۔ مجھے صرف اس بات کا ارمان ہے کہ میں اپنی آزاد گلزمین کو نہیں دیکھ سکوں گا۔''

ان چند جملوں کے ساتھ ہی چند فوجیوں نے شفیع کے آنکھوں پر پٹی باندھ کر دونوں ہاتھ پیچھے باندھ دیئے اور ایک خاموش اشارے کے منتظر فوجی نے چند لمحوں میں اپنا نشانہ باندھا اور جی تھری کی گولیوں کی تھرتھراہٹ نے ساری وادی کا سکوت توڑ دیا اور شفیع بلوچ اپنی دھرتی ماں کی گود میں آ گرے۔

شہید شفیع بلوچ اپنے وطن کی آزادی اور ہم وطنوں کو خوشحال دیکھنے کا جو خواب دیکھتے تھے وہ ان کی زندگی میں شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ شہید شفیع بلوچ اپنے وطن کی آزادی کا ارمان لئے صرف 25 برس کی عمر میں وطن پر قربان ہوگئے۔ اُن کی شادی

بھی نہیں ہوئی تھی اور یوں شہید شفیع بلوچ اپنے پیچھے پورا بلوچستان سوگوار چھوڑ گئے۔ شہید شفیع بلوچ کی اس قربانی کو احترام دینے اور اسے یاد رکھنے کی بہترین صورت یہی ہے کہ شہید کے ارمانوں کی تکمیل کی جائے۔

☆☆☆

شفیع بلوچ کی شہادت کا سبق، اور لائحہ عمل

شہید شفیع بلوچ نے اپنے مادر وطن بلوچستان اور بلوچ قوم کے حقوق کیلئے جدوجہد کا راستہ اختیار کر کے قربانی کی جو لازوال داستان رقم کی ہے وہ جہاں بلوچ قومی تحریک آزادی کی آبیاری میں کلیدی کردار کی حامل ہے وہیں ایک ایسا سبق بھی ہے جو بلوچ سرزمین پر قابض قوتوں کی جانب سے طاقت کے استعمال کا جواب بھر پور طاقت سے دینے کا تقاضا کرتا ہے۔ کیونکہ شفیع بلوچ نے اپنی شہادت کے موقع پر جس ارمان کے پورا ہونے کی خواہش کا اظہار کیا وہ بلوچ قومی حقوق کا حصول اور ہر قسم کے انسانی استحصال و جبر و استبداد سے پاک آزاد اور خوشحال بلوچستان کا قیام تھا۔ یہ ایک ایسی منزل ہے جو بلوچ سرزمین پر قابض قوتوں کے وجود کے خاتمے پر منتج ہوگی۔ لہٰذا اس منزل کی جانب بڑھنے والی بلوچ قومی تحریک کو بالادست استعماری طاقتیں کسی بھی صورت برداشت نہیں کرسکتیں اور جدوجہد و انقلاب کی فکر سے لیس ہر بلوچ مرد و زن کو نشانہ بنا رہی ہیں۔ بلوچ قوم کو اپنی منزل سے بھٹکانے کے لئے سازشی و دیگر حربے بھی آزمائے جا رہے ہیں۔ بلوچ نے جب بھی اپنی آواز جمہوری اور پُر امن انداز میں بلند کرنے کی کوشش کی ہے تو فوجی طاقت کے ہاتھوں اس کا گلا گھونٹ دیا گیا۔ نہتے ہاتھوں سے ہر قسم کے جدید ترین بھاری ہتھیاروں سے لیس قابض ریاست کے جبر اور جارحیت کا مقابلہ کرنا اور اس سے اپنی

سرزمین کو آزاد کرانا تاریخ میں کبھی بھی سودمند، موثر اور کامیاب نہیں رہا ہے۔ اور اس طرح کی ہر کوشش کی ناکامی پر بار بار یہ ضرورت محسوس کی گئی کہ طاقت کے جس ہتھکنڈے کا قابض قوتیں بے رحمانہ استعمال کرتی ہیں اس کا جواب بھی اسی انداز سے دیا جائے، یہ اسی سبق کا نتیجہ تھا کہ بلوچ نے بار بار ہتھیار اٹھائے۔ اسی راستے کو شفیع بلوچ نے بھی شعوری طور پر منتخب کیا اور وہ اس کے تقاضوں پر پورا اترنے میں بھی کامیاب رہے۔ اس طریقہء جہد نے نہ صرف تاریخ کے پہیے کو تیز کیا بلکہ قابض قوتوں کی صفوں میں بھی کھلبلی مچائی اور انہیں بھاری عسکری، معاشی اور سیاسی نقصانات سے دوچار کیا اور قابض قوتوں کے بحران میں اضافہ کیا۔ اس طریقہء جہد نے بلوچ قومی تحریک کی حالیہ تاریخی بلندی میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔ چونکہ 1988ء میں پارلیمنٹ کے ذریعے بلوچ مسئلے کا حل ڈھونڈنے اور بلوچ سماج کو تعلیم اور ترقی دے کر پھر آزادی کے لئے جدوجہد کرنے کی دلیلوں پر پارلیمانی ''جمہوری'' اور نہتے ہاتھ پُرامن جدوجہد کی ''حکمت عملی'' کی عمارت کھڑی کی گئی، جس نے بلوچ قوم کو غلامی، پسماندگی اور غربت وافلاس کا شکار بنا کر قومی تحریک کی اصل منزل اور مقصد سے دُور کر دیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پارلیمانی سیاست نے بلوچ قوم کو اسکی آزادی سے نہ صرف فاصلے بڑھائے بلکہ راہیں بھی جدا ہوتی چلی گئیں اور بہت ساروں سے تو یہ راہیں ہی کھو گئیں۔ جبکہ بلوچ قوم اور اس کی نمائندگی کے دعویدار سیاسی قوتوں کو اپنے اصل مقصد سے غافل پا کر قابض مقتدرہ قوتوں نے بلوچ

قوم کو غلامی کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیلنے اور اس کی سرزمین اور وسائل پر سامراجی قبضے کو مضبوط بنانے کیلئے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ بلوچ ساحل پر گوادر پورٹ، اورماڑہ نیول بیس اور دیگر عسکری و اقتصادی منصوبوں کا جال بچھایا جانے لگا اور بلوچوں کو اقلیت میں بدلنے کیلئے بلوچ ساحل پر غیر ملکیوں کی آبادکاری کا سلسلہ تیز بھی کر دیا گیا۔ دوسری طرف تیل، گیس، سونا، تانبا اور دیگر اہم قیمتی وسائل کے استعمال کیلئے چین، امریکہ، آسٹریلیا، چلی و دیگر ممالک کی کمپنیوں کی مدد سے بھاری بھرکم پروجیکٹس متعارف کرائے گئے۔ اور فوجی تسلط کو مضبوط بنانے کیلئے سوئی و کوہلو سے لے کر گوادر تک مزید چھاؤنیوں کی تعمیر کا اعلان کیا گیا۔ ''جمہوری و پارلیمانی'' پرامن طرز سیاست میں ایسا کونسا اقدام ہے جو بلوچ کی غلامی اور اس کے وسائل کی بے دریغ لوٹ مار کو دوام دینے والی قابض قوتوں کی راہ میں حائل ہو سکا ہو اور بلوچ دشمن پالیسیوں کو ناکام بنانے کے کام آ سکا ہو۔ ان سوالوں کا اطمینان بخش جواب مسلح ریاستی طاقت کے سامنے گذشتہ پارلیمانی جمہوری پُرامن طرز سیاست کا تجربہ دیتا ہوا نظر نہیں آتا، بلکہ یہ طرز سیاست اس کے برعکس نتائج کی تاریخ سے بھری پڑی ہے۔ اس طریقہء جہد کے مقابلے میں ریاستی طاقت کا جواب طاقت سے دینے کے فکر و عمل نے بلوچ مسئلے کو نہ صرف دنیا بھر میں متعارف کرایا بلکہ بلوچ قومی تحریک کو پیش قدمی اور کامیابیوں کی بلندیوں تک پہنچا دیا ہے اور پاکستانی حکمران طبقہ آج مجبور ہو گیا ہے کہ وہ اپنی پالیسیوں میں کم از کم سطحی طور پر تبدیلی لائے۔ آج بلوچستان کے

لئے جن سطحی سیاسی و اقتصادی اصلاحات و پیکجز کے اعلانات حکمران کررہے ہیں اور پنجاب کے بالادست طبقے سمیت مقتدرہ قوتوں میں جو سراسیمگی پھیلی ہوئی ہے، وہ طاقت کا جواب طاقت سے جواب دینے کا ہی نتیجہ ہے۔اسی طرح عالمی سطح پر بھی بلوچ قومی سوال پر توجہ دی جانے لگی ہے کہ پاکستان کی صنعتوں کو بندش اور شدید اقتصادی بحران کا سامنا ہے۔ اور سیاسی طور پر عدم استحکام اور فوجی نقصان بڑھ کر خطرناک صورت اختیار کرگیا ہے۔ پاکستان کا یہ اندرونی سیاسی ومعاشی خلفشار بلوچ قومی تحریک کی کامیابی کے امکانات روشن کررہا ہے۔ اسکے علاوہ موضوعی ونظری اعتبار سے اس صورت حال نے بلوچ قومی سوال کے درست حل اور طرز جہد کے یقین میں حائل تمام ابہام دُور کردیئے ہیں ۔اور یہ واضح نظر آرہا ہے کہ غلامی سے نجات کی منزل اور راستہ کونسا ہے۔آج بلوچ قومی تحریک دنیا کے بدلتے ہوئے حالات اور ممکنہ علاقائی اور عالمی سیاسی جغرافیائی تبدیلیوں کے تناظر میں اہم مقام پر پہنچ چکی ہے، جسے فیصلہ کن کہنا غلط نہ ہوگا۔ کیونکہ آج اگر اس تحریک کو اس کے درست منطقی انجام اور منزل تک نہ پہنچایا گیا تو اس کے پوری بلوچ قوم اور اس کی سیاست ومعیشت اور سماج پر انتہائی بھیانک اثرات مرتب ہوں گے۔ بلوچ قوم ایک ایسے پل صراط سے گزررہی ہے جس کے ایک طرف غلامی وذلت اور معاشی تباہی کی دوزخ ہے اور دوسری طرف قومی آزادی اور خوشحالی۔ اس لئے ضروری ہے کہ بلوچ قومی تحریک کی حقیقی قوتوں کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں۔ جو مسلح اور سیاسی

مزاحمت کے ذریعے منزل تک پہنچنے کے فاصلوں کو تیزی سے کم کررہے ہیں۔ یقیناً ایسا کرنے سے ہی شہید شفیع بلوچ کے ادھورے ارمانوں اور خواہشات کو ان کی انقلابی فکر کے مطابق پورا کیا جاسکتا ہے۔

☆☆☆

کچھ نظریے کے بارے میں

تحریر: شہید شفیع بلوچ

معاشرے کا رکن بننے کے باعث انسان صدیوں سے بلکہ ہزاروں سالوں سے ظاہر ہونے والی چیزوں کو دیکھتا ہے۔ پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے معلومات حاصل ہوتی ہیں کہ دنیا میں کیا تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں۔تب انسان اپنے ساتھی اور رہنماؤں کے ساتھ اپنی گفتگو میں اپنے تاثرات کو ظاہر کرتا ہے۔ جو کچھ اس نے سُنا، دیکھا یا پڑھا ہے۔ان کے بارے میں اپنی رائے ظاہر کرتا ہے۔لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہر ایک کے تاثرات ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔اس طرح ہم حیران ہوکر سوچتے ہیں کہ اس میں کون صحیح اور کون غلط ہے۔ پھر ہمیں بھی معلوم نہیں ہوتا کہ سیاسی واقعات مختلف اقوام، ممالک اور براعظم وغیرہ کے بارے میں خیالات اور اطلاعات غلط ہیں یا سچائی کے راستے پر لے جاتے ہیں۔

زیادہ تر انسان کے اندر دنیا کے اسرار ورموز میں پوشیدہ چیزوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی خواہش بھی پیدا ہوسکتی ہے۔ اس لئے ہم قدرتی مظاہرات کے بارے میں سوچنا شروع کردیتے ہیں کہ یہ روشن ستارے، یہ گلزمین اور اس سرزمین پر ساری چیزیں موجود ہیں یہ ساری چیزیں کہاں سے وجود میں آئیں؟ یہ چیزیں نہیں ہونگی تو پھر انسانیت کا کیا ہوگا؟ خوشی کیا ہے؟ معاشرے میں

کب سب خوش ہونگے۔زندگی کا مقصد کیا ہے؟ وہ کون ہے، کہاں ہے۔ان سوالوں سے دلچسپی نہ ہو۔اس مقام پر تو سوالات ہیں جو ہمیشہ ہر جگہ ہمارے سامنے ہیں اور ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتے۔ان سوالات کے بغیر ہمارا گزارہ نہیں ہوسکتا۔اگر یہ سوالات نہ ہوں تو ہم یہ بھی فیصلہ نہیں کرسکتے کہ صحیح اور غلط کیا ہے؟

تجربہ سکھاتا ہے کہ صرف وہی شخص ان سوالوں کے جوابات دے سکتا ہے جو دنیا کے بارے میں صحیح نظریہ رکھتا ہو۔وہی شخص جو چاروں اطراف میں ہونے والے واقعات کو سمجھتا ہے یا سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے۔لیکن نظریہ عالم کیا ہے؟ نظریہ عالم چند مجموعہ زندگی، مظاہر وواقعات کے بارے میں خیالات کا نظریہ عالم دنیا میں بہت ضروری کردار ادا کرسکتا ہے۔لینن نے اس موقع پر کہا تھا ”اگر سوشلسٹ واقعات کو تابع بنانا چاہتے ہیں تو ان کے پاس واقعات کو واضح کرنے کیلئے اس طرح کا نظریہ ضروری ہے جو ان کے گہری سوچ کا نتیجہ بنے اور (مستعدی) سے قائم ودائم رہے“۔

☆☆☆

27

قدم بڑھاؤ

اٹھو اے دنیا کے مظلومو، اٹھو
غیرت کے زندانیوں اٹھو
عقل نے بغاوت کا پرچم کھول دیا ہے
خرد گرج رہی ہے
آخری دور کی جوالا پھوٹ رہی ہے
آؤ ماضی کا قصہ پاک کر دیں
غلامی کی مصیبتیں جھیلنے والو
قدم بڑھاؤ صف بستہ ہو جاؤ
دنیا کی بنیادیں بدل رہی ہیں
آج تک ہم کچھ بھی نہ تھے
آؤ سب کچھ ہو جائیں
یہ آخری لڑائی ہے
قدم بڑھاؤ متحد ہو جاؤ

☆☆☆

28

گبریل پیری

’’یہ میرا یقین ہے کہ جو عوام دوسرے ملکوں کے عوام کو غلام بناتے ہیں دراصل وہ خود بھی اصل معنوں میں آزاد نہیں ہوتے۔‘‘

یہ 1941 کی بات ہے کہ فرانس شکست کھا چکا تھا۔اس کا پرچم سرنگوں تھا۔پیرس ایک نڈھال اور بے جان عورت کی طرح ہٹلر کے قدموں پر پڑا سسک رہی تھی۔

فرانس جرمن فاشسٹوں کے قبضہ میں تھا،اس پر جرمن پرچم لہرا رہا تھا، جو انقلاب اور آزادی کا دشمن تھا،فرانس کے مقامی سرمایہ داروں (قومی غداروں) نے قابض جرمن حاکموں کے ہاتھوں اپنے ملک کو بیچ دیا تھا تا کہ ان کا منافع باقی رہے۔ اس صورت حال کے پیش نظر فرانس کے مقامی باشندے شدید اضطراب میں تھے اور اور ان کے اندر قابض جرمنوں اور فرانس کے قومی غداروں کے خلاف نفرت پائی جاتی تھی۔ وہ کسی طرح سے قومی اور طبقاتی غلامی سے نجات چاہتے تھے۔اس مقصد کے لئے فرانس کی کمیونسٹ پارٹی نے فرانسیسی محنت کشوں کو منظّم کرنا شروع کر دیا۔

گبریل پیری ایک کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ ہونے کے باجود فکری طور پر محنت کش طبقے کے فلسفے سے وابستہ تھے۔اور اسی وابستگی کے باعث فرانسیسی کمیونسٹ پارٹی کی سینٹرل کمیٹی کے رکن بنے۔ گبریل پیری ایک ترقی پسند ادیب اور

ایک صحافی کی حیثیت سے مزدوی میں مصروف ہوئے۔

پیری ابھی 18 برس کا تھا کہ ملازم ہو گیا۔ وہ شادی شدہ تھے۔ ان کے ہاں کوئی بچہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ پیری پارٹی اور مزدوروں کے لئے لکھتے اور کام کرتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ نئے انسان کی تخلیق کے لئے صرف ذہنی آسودگی اور فکری پختگی کافی نہیں بلکہ عمل بھی ضروری ہے۔

پیری جو اپنی سیاسی سرگرمیوں کے باعث جرمن فاشسٹوں کو مطلوب تھے۔ ان کی جوانی بھی ڈھلی نہ تھی۔ اس کی عمر صرف 39 برس تھی جو پیرس کی طرح حسین تھا اور پیرس کے باغوں اور پارکوں کی طرح نفاست پسند بھی تھا۔ جرمن قبضہ گیروں کے ہاتھوں گرفتار ہوئے۔ ان کی بیوی بھی قید میں تھی۔

اس موقع پر پیری نے کہا کہ میری گرفتاری، مقدمے اور سزا نے میری خانگی زندگی میں کافی مشکلات پیدا کر دی تھیں، لیکن میرے والدین اچھی طرح جانتے تھے کہ میں ایک خودسر نوجوان کی حیثیت سے کام نہیں کر رہا تھا۔ بلکہ پوری فہم و فراست سے میں نے یہ راہ اختیار کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ہمیشہ میرے ان عقائد کا احترام کیا اور مجھے کبھی اس راہ سے ہٹانے کی کوشش نہیں کی۔

پیرس کی ایک جیل میں وہ رات کے آخری حصے میں بیٹھا چند سطریں لکھ رہا تھا۔ اُسے معلوم تھا کہ پو پھٹنے سے پہلے ہی اسے نازی سپاہیوں کی گولیوں کا مقابلہ کرنا ہے۔

وہ پوری رات بیس برس کی زندگی پر غور کرتا رہا۔ وہ موت کے منہ میں اپنی زندگی، اپنے مقاصد، اپنے نصب العین کا امتحان لے رہا تھا چنانچہ اس نے اس رات اپنے ایک دوست کو خط لکھا۔

''میرے دوستوں سے کہہ دینا کہ میں نے آخر دم تک اپنی زندگی کے مقاصد اور نصب العین سے منہ نہیں موڑا ہے۔ میرے ہم وطنوں کو سلام پہنچانا اور کہنا کہ میں اس لئے مر رہا ہوں تا کہ فرانس زندہ رہے۔''

گبریل پیری کو 1941 میں نازیوں نے گولیوں سے اُڑا دیا تا کہ فرانس کو غلام رکھا جائے۔ لیکن فرانس زندہ رہا۔

☆

جیولیس فیوچک

دنیا کے ان ہزاروں سرفروشوں میں چیکوسلواکیہ کا ایک نڈر جانثار سپوت جولیس فیوچک کا نام بھی آتا ہے جو ہزاروں چیک باشندوں میں انفرادی موت مرا اور ایسا کہ اس کی موت کچلے ہوئے محروم انسانوں کے لئے جدوجہد کی مثال بن گئی۔ جولیس فیوچک کو ایک چیک خاندان نے جنم دیا۔ چیک ماں نے اسے اپنی چھاتی کا دودھ پلایا۔ پراگ کی گلی کوچوں نے اسے پالا پوسا۔ جولیس چیک قوم کا ایک فرد تھا۔ چیک ادب میں اس کا درجہ بہت بلند تھا، وہ اپنے دور کا بہترین نقاد اور مستند صحافی تھا، مگر سب سے بڑھ کر وہ ایک محبّ وطن انسان دوست سیاسی کارکن تھا۔ اس لئے اس نے ادب اور سیاست میں کبھی امتیاز نہیں برتا۔

فیوچک 23 فروری 1903 کو پراگ میں پیدا ہوئے اور پراگ ہی کی مٹی میں مدفون ہیں۔ فیوچک چیکوسلواکیہ کے محنت کشوں کا ساتھی تھا۔ 1929 میں فیوچک اپنے پارٹی کے اخبار کا ایڈیٹر مقرر ہوا۔ جب ان کے انقلابی پارٹی کو خلاف قانون قرار دیا گیا تو فیوچک روپوش ہوگیا۔ مگر چیک محنت کشوں سے اپنا رشتہ ناطہ نہیں توڑا بلکہ زیر زمین رہ کر انھوں نے پارٹی میں تنظیم کاری کا کام جاری رکھا اور بھیس بدل بدل کر مزدوروں اور کسانوں کے احتجاجی مظاہروں، جلسوں اور دیگر عوامی تقریبات میں بھی شرکت کرتے رہے۔

فولاد کے کارخانے کے مزدور کے بیٹے کی حیثیت سے فیوچک نے اس وقت اپنے وطن پر قابض ہٹلر شاہی کو للکارنے کی ہمت کی جب چیکوسلواکیہ کے امراء و صاحب حیثیت اور حکمران قابض نازیوں کے تلوے چاٹ رہے تھے۔

اپریل 1941ء میں فیوچک اپنے چند دیگر پارٹی کے ساتھیوں کے ہمراہ گرفتار ہوئے۔ وہ ایک سال تک نازیوں کے جیل میں گلتا سڑتا رہا اس کا بدن لہولہان ہوگیا۔ بارہا موت اس کی آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی، ہر دن آخری دن اور ہر رات آخری رات محسوس ہونے لگتا۔ آخرکار 25 اگست 1943ء کو نازیوں نے اسے موت کی سزا سُنا دی۔ سزا سنانے کے 14 دن بعد 8 ستمبر 1943 کو اسے برلن میں پھانسی دے دی گئی۔ فیوچک جس مقصد کی خاطر قربان ہوئے وہ چیک قوم اور دنیا بھر کے غلام قوموں کی آزادی کا مقصد تھا۔

☆